© rasailojaraid.com

بحث ونظر

اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں اور مزید محاصل کا مسئلہ

(ایک فقہی تجزیہ)

جناب ظفر الاسلام صاحب

اسلامی نقطۂ نظر سے ریاست ایک اجتماعی ادارہ کا نام ہے، جس کے وجود میں آنے کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کے دین کا قیام اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا اہتمام ہے ارشاد ربانی ہے

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج: ۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کریں، معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں۔

اس آیت کی روشنی میں اسلامی ریاست کی بنیادی ذمہ داری یہ قرار پائی کہ وہ دین کے نفاذ وتحفظ کا اہتمام کرے، شریعت کو نافذ کرے اور لوگوں میں معروف کی اشاعت ومنکر کے خاتمہ کے لیے اقدام کرے لیکن اسی کے ساتھ ان تمام امور کی انجام دہی بھی اسلامی ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل ہے جو اس کے بنیادی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں[1]۔ اس طور پر ملک میں امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام، عوام کی بنیادی

---

[1] اصول فقہ کا یہ معروف قاعدہ ہے کہ اگر کسی امر واجب کی تکمیل کسی دوسرے کام پر موقوف ہو یا کوئی کام کسی واجب کے پورا کرنے کا وسیلہ بنے تو وہ خود بھی واجب ہو جاتا ہے۔ ابن تیمیہ فرماتے ہیں "مالا یتم الواجب الا بہ فھو واجب" (السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، بیروت ۱۹۶۶ء، ص ۲۱)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضروریات کی تکمیل کے اہتمام، تعلیم و تربیت اور علاج و معالجہ کے معقول انتظام اور جملہ اجتماعی مفادات کے تحفظ کی ذمہ داری بھی اسلامی ریاست پر عاید ہوتی ہے۔ اسلام درحقیقت ایک فلاحی ریاست کے تصور کا حامل ہے اور اس کے اس تصور کی امتیازی خصوصیت انسانی زندگی کے دنیوی و اخروی دونوں پہلوؤں کی تعمیر و ترقی کا اہتمام ہے۔ اگر ایک جانب اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ عوام میں دینی اقدار کو فروغ دے، مذہبی و اخلاقی تقاضوں کی تکمیل کی خاطر انھیں سہولتیں بہم پہونچائے اور ان کی زندگی کو اسلامی طرز کے مطابق ڈھالنے کے لیے تبلیغ و اشاعت کا اہتمام کرے تو دوسری جانب اس کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ ایسا نظم قائم کرے کہ معاشرہ کا کوئی فرد بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے اور عام شہریوں کو معاشی، معاشرتی و علمی ترقی کے مواقع فراہم ہوں اسلامی ریاست کی پہلی نوع کی ذمہ داریاں نہایت بدیہی و مسلم ہیں، یہاں ان سے قطع نظر محض ان ذمہ داریوں کی وضاحت مقصود ہے جن کا تعلق عوام کی معاشی و معاشرتی ترقی کے اہتمام سے ہے اور جو ریاست کے اخراجات میں خاص اضافہ کا باعث بنتی ہیں۔

ریاست کی زیر بحث ذمہ داریوں میں عوام کی بنیادی ضروریات زندگی[1] کی تکمیل کا اہتمام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا بخوبی اندازہ ذیل کے ارشادات نبوی سے ہوتا ہے

"من ولاہ اللہ عزوجل	وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں
شیئا من امور المسلمین	کے امور کی نگرانی بخشی اور اس نے

---

[1] نص سے اس کی صراحت نہیں ملتی کہ وہ بنیادی ضروریات کیا ہیں جن کی تکمیل کا اہتمام ریاست کی ذمہ داری ہے البتہ اصولی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تمام ضروریات جن پر انسانی زندگی کی بقا کا انحصار ہے بنیادی ضروریات میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ پروفیسر نجات اللہ صدیقی نے ان ضروریات میں غذا، لباس، مکان و علاج چار چیزوں کو شامل کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسلام کا نظریۂ ملکیت، دہلی ۱۹۷۸ء ص ۳۹۲-۳۹۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فاحتجب دون حاجتهم وخلتهم وفقرهم احتجب الله تعالٰی دون حاجته وخلته وفقره"[1]

ان کی حاجات و ضروریات اور فقر کے حالات کی پروا نہ کی تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ضرورت و احتیاج سے بے نیاز ہو جائے گا۔

ایک دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

"مامن امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجہد لہم و ینصح الا لم یدخل معہم الجنۃ"[2]

امیر جو کہ مسلمانوں کے امور کا ذمہ دار ہے اگر ان کی بھلائی کے لیے کوشش نہ کرے اور ان کے ساتھ خیر خواہی نہ کرے تو وہ ان کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل حاجت کی حاجت روائی کا اہتمام نہ کرنا خدائے تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہوتا ہے یہ بات خود اس کا ثبوت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروریات کی تکمیل کو صدر ریاست کی ذمہ داری قرار دیا۔ مزید براں ارشادات نبوی میں اصحاب امر کو عوام کے ساتھ خیر خواہی کی جو تاکید ملتی ہے اس کا مفہوم بہت وسیع ہے اس میں ان کے مادی و روحانی جملہ مفادات کا تحفظ شامل ہے سربراہ ریاست درحقیقت عوام کا سرپرست و نگراں ہوتا ہے اس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ کم از کم وہ ان کے لیے بنیادی ضروریاتِ زندگی کا سامان فراہم کرے[3]۔

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والفئی والامارہ، باب فیما یلزم الامام من امر الرعیۃ والاحتجاب عنہم (مطبع مجیدی، دہلی، ۱۳۶۳ھ)

[2] مسند ابی عوانہ، دائرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۳۶۳ھ، جلد اوّل، ص ۱۳۲

[3] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد "السلطان ولی من لا ولی لہ" (سلطان اس شخص کا ذمہ دار ہوتا ہے جس کا کوئی سرپرست نہیں ہوتا) کو عام طور پر نکاح وغیرہ جیسے معاملات کے ضمن میں ذکر کیا جاتا ہے، لیکن اس کے مفہوم کو امور عامہ تک بھی وسیع کیا جا سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین کو امت کی سربراہی نصیب ہوئی انھیں ریاست کی اس ذمہ داری کا پوری طرح احساس تھا۔ خلیفۂ اول و دوم دونوں کے خطبات میں خلیفہ کے فرائض میں عوام کے ساتھ خیر خواہی کرنے کمزوروں اور مظلوموں کے حقوق پورا کرنے اور حاجتمندوں کی حاجات رفع کرنے پر زور ملتا ہے[۱]۔ حضرت عمرؓ بنفس نفیس لوگوں کے حالات کا جائزہ لیتے، ان کی ضروریات کا پتہ لگاتے اور انھیں پورا کرنے کا اہتمام فرماتے تھے[۲]۔ مزید براں عمال اور گورنروں کو بھی یہ ہدایت کرتے تھے کہ وہ عوام کی ضروریات کی تکمیل کی فکر رکھیں اور اپنے تک ان کی رسائی کو آسان بنائیں تاکہ وہ بلا جھجک اپنی ضروریات و حاجات پیش کر سکیں[۳]۔ مشہور اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے اس اعلامیہ سے بھی اسی ذمہ داری کا شعور ابھرتا ہے " وما احد منکم تبلغنی حاجتہ الا حرصت ان اسد من حاجتہ ما قدرت علیہ"[۴] (تم میں سے جس کسی کی بھی ضرورت کا مجھے علم ہوگا میری خواہش ہوگی کہ حتی المقدرت میں اسے پورا کردوں)

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری کہ عوام کی بنیادی ضروریات پورا کرنے کا اہتمام کرے صرف مسلمان شہریوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ریاست کے حدود میں رہنے والے جملہ باشندوں کو محیط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل حاجت

۱؎ دیکھئے ابن ہشام، کتاب سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قاہرہ ۱۳۲۲ھ جلد ۳، ص ۲۷۳، ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، تاریخ الرسل والملوک، لیڈن، ۱۸۸۱ء جلد ۳ ص ۱۸۲۹، ابن کثیر البدایہ والنہایہ مطبع السعادۃ، مصر، الجزء السابع، ص ۴۶

۲؎ طبری، لیڈن ۱۸۹۲ء، جلد ۵ ص ۲۷۴۳، ابن جوزی، سیرت عمر بن الخطاب، مصر ۱۳۴۲ھ ص ۶۲-۶۸

۳؎ ابو یوسف، کتاب الخراج، بولاق، مصر، ۱۳۰۲ھ ص ۶۶، ۱۰۸، ابوبکر محمد بن محمد الطرطوشی، سراج الملوک، مصر، ۱۳۰۶ھ ص ۱۰۹

۴؎ ابن عبدالحکم، سیرت عمر بن عبدالعزیز، مصر ۱۳۴۶ھ، ص ۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی حاجت روائی میں اسلام مسلم و غیر مسلم میں بھی تفریق کو روا نہیں رکھتا وہ مسلمانوں کے مثل ذمیوں کے حق میں بھی یہ ضمانت دیتا ہے کہ ریاست انھیں بنیادی وسائل حیات سے محروم نہ رہنے دے اور اپنے وسائل سے ان کی ضروریات رفع کرنے کا بھی اہتمام کرے۔ صدر اول کی اسلامی ریاستوں میں اس اصول پر عمل آوری کی متعدد مثالیں ملتی ہیں[1]۔

اس ذمہ داری کی انجام دہی کا یہ مطلب نہیں کہ ریاست ہر حالت میں اپنے تمام شہریوں کی ان ضروریات کے پورا کرنے کی پابند ہے بلکہ اصولی طور پر یہ ہر شخص کا انفرادی فریضہ ہے کہ وہ اپنی قوت و استعداد کو کام میں لاتے ہوئے اپنے لیے ضروریات زندگی کا سامان فراہم کرے، اسلام جد و جہد اور تگ و دو کی قدر کرتا ہے وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ افراد معاشرہ ریاست یا کسی اجتماعی ادارہ کے دست نگر بنے رہیں۔ البتہ اگر کوئی کوشش کے باوجود اپنی ضروریات کے مطابق وسائل فراہم کرنے سے قاصر رہتا ہے یا کسی معذوری کی وجہ سے جد و جہد کرنے کے قابل نہیں ہے تو اسلام ایسے افراد کی ضروریات کی تکمیل کا ذمہ دار ریاست کو قرار دیتا ہے تاکہ وہ ان وسائل سے محروم نہ رہیں جو تقاضائے حیات کے لیے درکار ہیں۔ اصل میں یہ ذمہ داری بحیثیت مجموعی معاشرہ کے تمام ذی استطاعت و اصحاب ثروت پر عائد ہوتی ہے۔ جیسا کہ فقہاء محروم و نادار افراد کی کفالت عامہ پورے معاشرہ پر فرض کفایہ قرار دیتے ہیں[2]۔ لیکن اگر اصحاب استطاعت اس ذمہ داری سے غافل ہوں یا

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج، ۲، ۷، ۸۴ - ۸۵، احمد بن یحییٰ بلاذری، فتوح البلدان، قاہرہ ۱۳۱۹ھ، ص ۱۳۶۔

[2] امام نووی لکھتے ہیں "ومن فرض الکفایہ ...... دفع ضرر المسلمین ککسوۃ عار وطعام جائع اذا لم یندفع بالزکوٰۃ وبیت المال" (منہاج الطالبین، مصر ۱۳۴۳ھ ص ۱۲۵) اور فرض کفایہ میں سے ہے مسلمانوں کی ضروریات رفع کرنا مثلاً ننگے کو کپڑا پہنانا اور بھوکے کو کھانا کھلانا، نیز دیکھئے ابن حزم، المحلی، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر ۱۳۴۹ھ الجزء السادس ص ۱۵۶، ابو اسحاق الشاطبی الموافقات فی اصول الشریعہ، مطبعہ سلفیہ، مصر ۱۳۴۱ھ، الجزء الثانی ص ۱۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رضا کارانہ طور پر اس کی انجام دہی ممکن نہ ہو تو ایسے حالات میں ریاست کا حرکت میں آنا اور قوت نافذہ کا استعمال کرنا لازمی ہو جاتا ہے اس لیے کہ ریاست اجتماعی امور کی نگراں اور مصالح عامہ کی محافظ ہوتی ہے۔ اب یہ صدر ریاست کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو نبھانے کے لیے جو طریقہ چاہے اختیار کرے۔

بنیادی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے علاوہ اجتماعی مفاد کے دیگر کام جن کی انجام دہی کی ذمہ داری ریاست پر عاید ہوتی ہے وہ ہیں تعلیم و تربیت اور علاج و معالجہ کا انتظام اور عوام کی خوشحالی اور ملک کی معاشی ترقی کا اہتمام۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کے ضمن میں اولین مقام دینی تعلیم کو حاصل ہے کم از کم اس حد تک تعلیم کی سہولتیں بہم پہونچانا ضروری ہے کہ لوگ اسلام کے بنیادی عقاید، عبادات کے طور و طریق اور عام معاملات زندگی میں اسلامی آداب سے واقف ہو جائیں۔ لیکن ریاست کی تعلیمی ذمہ داریاں یہیں پر ختم نہیں ہو جاتیں، اس پر یہ بھی واجب ہوتا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی عام تعلیم و تربیت کا انتظام کرے اور انھیں مختلف علوم و فنون سے بہرہ ور ہونے کے مواقع فراہم کرے تاکہ ان میں باشعور و ذمہ دار شہری بننے کی صلاحیت پیدا ہو اور ان کے رہن سہن کے طریقوں کی اصلاح ہو سکے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے عام تعلیم کی اہمیت واضح ہوتی ہے، بدر کی جنگ کے خاتمہ پر جو قیدی ہاتھ آئے تھے ان میں سے متعدد کا فدیہ آپ نے یہ قرار دیا تھا کہ وہ مدینہ کے دس دس لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں[1]۔ مزید براں آپ نے اصل صفہ کی دینی تعلیم و تربیت کے علاوہ ان کی عام تعلیم کا بھی اہتمام فرمایا تھا[2]۔ حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ نے بچوں کی تعلیم کے لیے معلم مقرر کیے تھے جن کی کفالت بیت المال کرتا تھا[3]۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں

---

[1] محمد ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، بیروت ۱۹۵۷ء، الجزء الثانی ص ۲۲
[2] سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی کسب المعلم (الجزء الثانی، ص ۱۲۸-۱۲۹)
[3] علی المتقی برہانپوری، کنز العمال، دائرۃ المعارف، حیدرآباد ۱۳۱۲ھ، الجزء الاول ص ۲۱۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیت المال نہ صرف معلمین کے اخراجات برداشت کرتا تھا بلکہ اس سے طلبہ کو وظائف بھی ملتے تھے[1]

اسلامی ریاست کی زیر بحث ذمہ داری پر روشنی ڈالتے وقت یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ موجودہ دور میں تعلیم کی نوعیت بدل چکی ہے اور اس کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے۔ دینی علوم کی اہمیت و فضیلت کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی ضرورت وافادیت اس قدر واضح ہو چکی ہے کہ اس سے پہلوتہی نہیں کی جا سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ خود دینی علوم کو فروغ دینے اور ان کی افادیت کو عام کرنے کے لیے آج عصری علوم سے بہرہ ور ہونا ضروری سا ہو گیا ہے۔ موجودہ دور میں جدید تعلیم سے استفادہ کے بغیر اسلام کی صحیح ترجمانی و نمائندگی کا حق ادا کرنا مشکل ہے۔ مزید براں ملک کو استبدادی واستعماری طاقتوں کی دخل اندازی سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی یہ درکار ہے کہ اسے علمی وفنی طور پر خود کفیل بنایا جائے اور غیروں کی علمی مہارت وفنی ترقی پر انحصار نہ کیا جائے اس کے علاوہ ملک کے وسائل قدرت کو کام میں لانے اور اس کی معاشی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ شہریوں میں مختلف علوم و فنون کے ماہرین تیار کیے جائیں۔ ان نئے تقاضوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیمی میدان میں اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں آج کے دور میں کافی بڑھ گئی ہیں۔ اس لیے دینی درس گاہوں کے انتظام کے ساتھ ساتھ اس پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ سائنسی و تکنیکی اور صنعتی و حرفتی تعلیم و تجربہ کے مراکز قائم کرے تاکہ تعلیم کے دینی و عصری دونوں تقاضے پورے ہو سکیں۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ حفظان صحت کا اہتمام بھی ریاست کی ذمہ داریوں کا ایک اہم حصہ ہے اگر اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے، عوام کی معاشرتی زندگی کے معیار کو بلند کرنے اور ملک کی عام ترقی کے لیے تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنا اور علم کی فضا کو عام کرنا ضروری ہے تو ان کی عام صحت کو برقرار رکھنے اور ان کی قوت عمل کو مضبوطی بخشنے کے لیے

---

[1] ابو عبید کتاب الاموال، قاہرہ، ۱۳۵۳ھ ص ۲۶۱، ابن عبد الحکم، محولہ بالا ص ۱۶۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاج کی آسانیاں مہیا کرنا اور بیماریوں کی روک تھام کی تدابیر اختیار کرنا بھی کچھ کم اہم کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ریاست کو نہ صرف شفاخانے اور اسپتال قائم کرنے ہوں گے بلکہ نئے تقاضوں کی روشنی میں علم طب اور فن جراحت کو بھی ترقی دینا ہوگا اس کے لیے ایسے طبی اداروں کا قیام بھی درکار ہوگا جہاں مختلف طریقہ ہائے علاج کی تعلیم و تجربہ کی سہولتیں فراہم ہوں۔ مزید براں مختلف جراثیمی بیماریوں کے سد باب کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ ریاست عام صفائی ستھرائی کا اہتمام کرے، پینے کے لیے صاف پانی کی سہولت کا نظم کرے اور مستعمل و غلیظ پانی کی نکاسی کو بہتر بنائے۔

مذکورہ امور کی انجام دہی کے علاوہ عوام کی خوشحالی اور ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کا اہتمام بھی ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ یہ ذمہ داری چند وجوہ سے خاص اہمیت کی حامل ہے اول یہ کہ عوام کی فلاح و بہبود جس کی ریاست ضامن ہوتی ہے اس سے براہ راست وابستہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ریاست کا استحکام اور اس کی دفاعی قوت کافی حد تک اس کی معاشی بنیادوں کی مضبوطی پر منحصر ہے۔ تیسرے یہ کہ ملک کو بیرونی مداخلت کے خدشات اور استعماری عناصر کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی معاشی ترقی بھی ناگزیر ہے اس لیے کہ معاشی بدحالی اور صنعتی و تکنیکی پسماندگی بیرونی مداخلت کے لیے بہترین موقع فراہم کرتی ہے جیسا کہ تاریخی واقعات شاہد ہیں اس کے علاوہ اسلام کی نشر و اشاعت جو ریاست کے اہم فرائض میں داخل ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی ریاست کی اقتصادی حالت کی بہتری درکار ہے تاکہ دعوت و تبلیغ کے لیے ابلاغ عامہ کے ترقی یافتہ ذرائع استعمال کیے جا سکیں اور نئے تقاضوں کی روشنی میں اسلام کی اشاعت کا اہتمام کیا جا سکے۔

متعدد فقہاء، بالخصوص ابن تیمیہ[1] اور امام نووی[2] نے ضروریات زندگی کی پیداوار کے

---

[1] ابن تیمیہ، الحسبۃ فی الاسلام، مصر ۱۳۱۸ھ، ص ۱۷

[2] منہاج الطالبین، محولہ بالا ص ۱۲۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اہتمام اور زراعت و تجارت، صنعت و حرفت جیسے معاشی ذرائع کے استعمال کو فرض کفایہ میں شمار کیا ہے۔ اس لیے کہ ان کے بغیر مصالح عامہ کا تحفظ حاصل نہیں ہو سکتا اس سے قبل یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ اگر اصحاب استطاعت کے ذریعہ رضاکارانہ طور پر کفائی امور انجام پذیر نہ ہو سکیں تو ایسی حالت میں ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان کی انجام دہی کے لیے مناسب عملی اقدام کرے اس لیے کہ ریاست ہی اجتماعی امور کی نگراں ہوتی ہے اور ان کا تحفظ قیام ریاست کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے خلافت راشدہ اور بعد کے دور میں اس ذمہ داری کے احساس اور اس کی تکمیل کے واضح ثبوت ملتے ہیں، اس دور میں ملک کی معیشت کا انحصار زراعت و تجارت کی ترقی پر تھا اس کے پیش نظر سربراہان ریاست نے ان کی ترقی کے ذرائع فراہم کرنے کو اپنی انتظامی پالیسی کا ایک اہم جز بنایا۔ زراعت کی ترقی میں آبپاشی کی سہولت اہم رول ادا کرتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں اس مقصد کے تحت نئی نہروں کی تعمیر اور قدیم کی مرمت عمل میں آئی[1]۔ ان سے زرعی معیشت کو تقویت پہنچنے کے علاوہ مختلف شہروں کے مابین تجارت کو فروغ دینے میں بھی مدد ملی، خلیفہ دوم نے ریاست کے وسائل سے ذرائع حمل ونقل کو بھی کافی وسعت و ترقی دی[2] اس سے تجارت کو بھی فروغ ملا اور عام مسافروں کو بھی سہولتیں فراہم ہوئیں۔ صوبہ کے منتظمین کو بھی آپ کی یہی ہدایت تھی کہ وہ مقامی حالات کی روشنی میں وہاں کی معاشی ترقی کی تدبیریں اختیار کریں۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے دور میں کسانوں کو زرعی اخراجات کی تکمیل کے لیے قرض کی سہولتیں بھی حاصل تھیں[3]۔ امام ابو یوسف نے خلیفہ ہارون رشید کو ترقی زراعت کے لیے ذرائع آبپاشی کی توسیع کا مشورہ دیا تھا[4] اور اس کے وافر ثبوت موجود ہیں کہ اسے عملی جامہ پہنایا گیا۔

---

[1] ابن عبدالحکم، فتوح مصر، ص۱۶۳-۱۶۴، مقریزی، کتاب الخطط والآثار، مطبعۃ النیل، مصر ۱۳۲۴ھ ص۱۱۹-۱۲۰، بلاذری، ۳۵۱-۳۵۲، ۳۷۳ [2] فتوح مصر، ص۱۶۱ [3] ابوعبید، کتاب الاموال، ص۲۵۱ [4] ابویوسف، کتاب الخراج ص۵۵-۵۶، ۶۲-۶۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بات واضح ہے کہ اس دور کے حالات کے اعتبار سے ملک کی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے زراعت و تجارت کی ترقی پر خاص زور دیا گیا لیکن آج کے دور میں معیشت کی ترقی کے ذرائع اور استحکام کے طور و طریق بدل چکے ہیں، کسی ملک کی معیشت کا انحصار زراعت و تجارت ہی پر کیوں نہ ہو انھیں ترقی دینے کے لیے صنعت حرفت ضروری ہو گیا ہے۔ جدید آلات کی فراہمی، نئے تکنیک سے واقفیت، ذرائع حمل و نقل کی توسیع اور تجارتی سامانوں کی تیاری صنعتی و فنی میدان میں آگے بڑھے بغیر ممکن نہیں اس کے علاوہ معاشی خود کفالت کا حصول معیشت کے مختلف پہلوؤں کے فروغ پر منحصر ہے۔ اس لیے آج کے دور میں اسلامی ریاست کی ذمہ داری میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کے لیے مختلف سمتوں میں اقدام کرے، زراعت و تجارت کو فروغ دینے کے ساتھ جدید صنعت و حرفت کے مراکز قائم کرے اور فنی مہارت کے ذرائع بھی مہیا کرے۔

ان حقائق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کا اہتمام کوئی نئی ذمہ داری نہیں ہے جس سے اسلامی ریاست کو پابند کیا جا رہا ہے بلکہ اسلام کے ابتدائی دور ہی سے یہ ریاست کے فلاحی کاموں کا ایک اہم حصہ رہا ہے اور اس سے مقصود عوام کی زندگی کو خوش حال بنانا ہے، یہ عمل شریعت کے منافی نہیں بلکہ شریعت کے منشاء کی عین تکمیل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس ذمہ داری کی انجام دہی میں سربراہ حکومت کی غفلت و کوتاہی کو خیانت سے تعبیر کرتے تھے[1] یہی وجہ ہے کہ فقہاء و مفکرین نے عام طور پر صدر ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دیتے ہیں کہ وہ عوام کی خوشحالی کے وسائل فراہم کرے اور انھیں ترقی دے[2]

عوام کی زندگی خوش حال بنانے میں رفاہ عام کے کاموں کو خاص دخل ہے اس

---

[1] بلاذری، ص ۴۳۹ [2] ابو یوسف، کتاب الخراج۔ ص ۱۰۳، ۹-۱۰،
الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ۱۸۹-۱۹۰، الغزالی، المستصفی، قاہرہ ۱۹۳۷ء، الجزء الاول ۱۳۹-۱۴۰، ابن قیم الجوزی، اعلام الموقعین، قاہرہ ۱۹۵۵ء جلد ۴ ص ۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں وہ تمام کام شامل ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں راحت و آسائش کا ذریعہ بنتے ہیں اور لوگوں کو ایک خوشگوار زندگی گذارنے کا موقع عطا کرتے ہیں، تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ان کی نوعیت میں تبدیلی اور ان کے دائرہ میں وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ عہد حاضر میں اس نوع کے کاموں نے جو وسعت اختیار کرلی ہے وہ بخوبی واضح ہے وہ کام جن کے بغیر آج رفاہ عام کا تصور نہیں کیا جاسکتا نئے تقاضوں کے مطابق حمل و نقل کی سہولتیں فراہم کرنا (سڑکوں، شاہراہوں، پلوں، ریلوے لائنوں، ہوائی اڈوں وغیرہ کی تعمیر) گھریلو استعمال و آبپاشی کے لیے پانی کی فراہمی کے نئے ذرائع اختیار کرنا، روشنی وایندھن کے نئے وسائل (بالخصوص شہری علاقوں کے لیے) مہیا کرنا، بستیوں قصبوں و شہروں کی صفائی ستھرائی اور پبلک مقامات پر روشنی کا اہتمام کرنا، رسل و رسائل کے ذرائع اور مواصلاتی نظام کو ترقی دینا، امن وامان کے قیام اور شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے پولیس فورس کا انتظام کرنا وغیرہ ہیں، اس لیے اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نئے رجحانات و نئے تقاضوں کی روشنی میں رفاہ عام کے کاموں کا منصوبہ بنائے اور انھیں اپنے وسائل سے پورا کرے تاکہ عوام کی فلاح بہبود کا حق ادا ہوسکے۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ اسلامی ریاست گوناگوں اور وسیع ذمہ داریوں کی حامل ہے اور نئے تقاضوں کے پیش نظر ان میں دن بہ دن وسعت پیدا ہوتی جارہی ہے۔ دوسری جانب ریاست کے جو معروف ذرائع آمدنی ہیں ان کے مصارف بھی جدا جدا ہیں اور ان میں سے ایک کی کمی دوسرے کے ذریعہ نہیں پوری ہوسکتی۔ مثال کے طور پر عشر و زکوٰۃ کی آمدنی حکومت کے عام عملہ کی تنخواہ یا اس کے انتظامی مصارف میں نہیں خرچ کی جاسکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ریاست پر یہ غیر ضروری بوجھ نہیں ڈالا جاسکتا کہ وہ اپنے وسائل سے قطع نظر کرکے اپنی ذمہ داریوں کو وسعت دے یا ترقیاتی منصوبے تشکیل دے لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ بنیادی ذمہ داریوں کی تکمیل اور ان امور کی انجام دہی ریاست پر بہرحال واجب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے جن سے مصالح عامہ کا تحفظ مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ ان ذمہ داریوں میں سے بعض کی تکمیل یا کسی فلاحی کام کے لیے ریاست کو متعینہ محاصل سے ہونے والی آمدنی کافی نہ ہو اور اسے مزید وسائل درکار ہوں، اس صورت حال میں ریاست کیا طرز عمل اختیار کرے گی اس کا تعلق فقہ کے ایک اہم مسئلہ سے ہے اور وہ یہ کہ کیا ریاست کو مزید محاصل عائد کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ہمیں اصولی رہنمائی قرآنی آیات و احادیث نبوی سے ملتی ہے قرآن میں واضح طور پر یہ بتایا گیا ہے،

وَفِيٓ أَمْوَٰلِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ	اور ان کے (دولت مند افراد کے)
وَٱلْمَحْرُومِ ٥ (الذاریات: ۱۹)	مالوں میں سائل و محروم کا بھی حق ہے

اس آیت سے نہ صرف واجب الادا محاصل کی ادائیگی مراد ہے بلکہ اجتماعی ضروریات کے لیے مزید انفاق بھی مطلوب ہے۔ قرآن کریم اصحاب مال کو یہ بھی ہدایت دیتا ہے کہ بنیادی ضروریات کی تکمیل کے بعد مال کا جو حصہ بچ رہے اسے دوسرے افراد کی حاجت روائی اور اجتماعی کاموں میں خرچ کریں، ارشاد ربانی ہے:۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ	اور یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں
قُلِ ٱلْعَفْوَ (البقرہ: ۲۱۹)	کہ کتنا خرچ کریں کہئے کہ جو کچھ فاضل ہو۔

حدیث سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام میں مال کے حقوق کی ادائیگی صرف زکوٰۃ تک محدود نہیں ہے ارشاد نبوی ہے:

عن فاطمة بنت قيس قالت	فاطمہ بنت قیس سے مروی ہے کہ
سمعت النبي صلى الله عليه	انھوں نے کہا میں نے نبی کریم صلی اللہ
وسلم يقول ان في المال	علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ مال میں زکوٰۃ
لحقا سوى الزكوٰة [1]	کے علاوہ بھی حق ہے۔

---

[1] جامع الترمذی (جلد دوم، صـ۲۲) کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ۔ نیز دیکھئے مسند دارمی (دائرۃ المعارف، حیدر آباد) کتاب الزکوٰۃ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور حدیث سے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اسی اصول کی مزید وضاحت ملتی ہے۔ "آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مالدار مسلمانوں پر ان کے مال میں اس قدر فرض کیا ہے کہ ان ضرورت مندوں کی کفالت ہو جائے"[1]

ان آیات و احادیث سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرہ کے محروم و محتاج افراد کی حاجت روائی اور اجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لیے اگر بیت المال کے معروف وسائل کفایت نہ کریں تو اصحاب استطاعت اور مالدار مزید انفاق کے مکلف ہیں۔ اسی سے ریاست کا یہ اختیار بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر اجتماعی ضروریات اس طریقہ سے پوری نہ ہو رہی ہوں تو وہ اصحاب استطاعت سے مزید محصول کی صورت میں یا کسی اور شکل میں ضرورت کے مطابق وسائل فراہم کرے۔ اجتماعی مفادات و مصالح عامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء و مفکرین پر زور لفظوں میں ریاست کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ ان کے خیالات کے تجزیاتی مطالعہ سے واضح ہوگا۔

امام قرطبی کے بقول علماء کا یہ متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اگر زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد کوئی (اجتماعی) ضرورت پیش آئے تو اس کے لیے مزید مال خرچ کرنا مسلمانوں پر واجب ہے[2]

ابن حزم کے یہاں مزید وضاحت ان الفاظ میں ملتی ہے:۔

و فرض علی الاغنیاء من اھل	ہر ملک کے دولت مندوں پر یہ فرض
کل بلد ان یقوموا بفقرائھم	ہے کہ وہ اپنے فقراء کی ضروریات پوری
ویجبرھم السلطان علی ذٰلک	کریں اور سلطان ان کو ایسا کرنے پر
ان لم تقم الزکوٰۃ بھم ولا فیٔ	مجبور کر سکتا ہے اگر زکوٰۃ یا اموال فیٔ
سائر اموال المسلمین بھم"[3]	اس کی کفایت نہ کر سکیں۔

---

[1] طبرانی، المعجم الصغیر، مطبع انصار، دہلی، ص ۹۱

[2] محمد بن احمد القرطبی الجامع لاحکام القرآن، مطبع دار الکتب، القاہرہ ۱۹۵۷ء، الجزء الثانی ص ۲۲۳۔

[3] ابن حزم، المحلی، محولہ بالا ص ۱۵۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشہور مفکر اسلام ابن تیمیہ بھی اس نکتہ پر خاص زور دیتے ہیں کہ مالی حقوق کی ادائیگی صرف زکوٰۃ تک محدود نہیں ہے بلکہ جہاد کی تیاری اور فقراء و مساکین کے لیے غذا و لباس کے اہتمام جیسی اجتماعی امور کی انجام دہی کے لیے بوقت ضرورت مسلمانوں سے مزید مال طلب کیا جاسکتا ہے۔ مزید براں وہ اسے ان علماء کی کوتاہ بینی اور کم علمی سے تعبیر کرتے ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور کوئی حق نہیں ہے[1]۔ اس سے قبل یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ امام نووی بھوکوں کے لیے کھانا اور ننگوں کے لیے لباس کی فراہمی اور اس نوع کی ضروریات کی تکمیل کو فرض کفایہ تصور کرتے ہیں اگر زکوٰۃ اور بیت المال کے دیگر وسائل سے یہ مقصد پورا نہ ہو[2]۔

محروم و محتاج افراد کی حاجت روائی کے علاوہ دیگر جن ضروریات کے لیے فقہاء کی رائے میں ریاست کو مزید محاصل عائد کرنے کا اختیار حاصل ہے وہ ہیں دفاعی و فوجی مصارف۔ امام سرخسی اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:-

فان لم یکن فی بیت المال	اگر بیت المال میں کوئی سرمایہ نہ ہو
مال و مست الحاجۃ الی	اور دفاع کے لیے فوجی تیاری درکار
تجھیز الجیش لیذبوا عن	ہو تو امام کو اختیار حاصل ہے کہ وہ
المسلمین فلہ ان یحکم علی	بقدر ضرورت لوگوں پر محصول عاید
الناس بقدر ما یحتاج	کرے اس لیے کہ امام مسلمانوں کے
الیہ لذالک لانہ مامور	اجتماعی امور کا نگراں ہوتا ہے اگر وہ
بالنظر للمسلمین وان لم	دفاع کے لیے لشکر تیار نہ کرے گا تو
یجھز الجیش للدفع	اندیشہ ہے کہ مشرکین مسلمانوں پر
ظھر المشرکون علی	غلبہ حاصل کرلیں گے اس لیے حسن
المسلمین فمن حسن التدبیر	تدبیر کا تقاضا یہی ہے کہ جنگی تیاری

---

[1] فتاوای ابن تیمیہ، بیروت، ۱۳۹۲ھ، جلد ۲۹، ص ۱۸۵ - ۱۸۷ [2] منہاج الطالبین ص ۱۲۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان يتحكم على ارباب الاموا	کے لیے جتنے مال کی ضرورت ہو
لقدر مايحتاج اليه	ایسے مالداروں سے وصول کیا جائے
لتجهيز الجيش ليامنوا	خواہ قوت کے استعمال کے ذریعہ
فيما سوى ذالك [1]	ہی کیوں نہ ہو تاکہ بقیہ کے بارے میں
	لوگ مامون ہو جائیں۔

صاحب ہدایہ بھی دفاعی اغراض کے لیے مزید محصول عاید کیے جانے کو جائز قرار دیتے ہیں بشرطیکہ بیت المال کے موجودہ وسائل اس کے متحمل نہ ہوں، ان کے خیالات کی ترجمانی ان الفاظ میں ملتی ہے

ويكره الجعل مادام	اور جعل (جنگ کے موقعہ پر فوجی ضروریات
للمسلمين فئ لانه يشبه	کے لیے جو مخصوص محصول عاید کیا جائے)
الاجر ولا ضرورة اليه	مکروہ ہے جب تک کہ مسلمانوں کو فئ
لان مال بيت المال	کا مال میسر ہے اس لیے کہ یہ اجرت
معد لنوائب	کے مشابہ ہے اور بیت المال کے
المسلمين فاذا لم	وسائل ہوتے ہوئے اس کی چنداں
يكن فلا باس	ضرورت نہیں کیونکہ بیت المال مسلمانوں
به بان يقوى	کی پیش آمدہ ضروریات کو پورا کرنے
بعضهم بعضا	والا ہوتا ہے۔ البتہ اگر بیت المال میں
لان فيه دفع	کچھ موجود نہ ہو تو ان میں سے بعض کو
الضرر الاعلى	بعض کے ذریعہ تقویت دینے میں کوئی
بالحاق الادنى [2]	حرج نہیں ہے اس لیے کہ اس طرح
	ایک ادنی ضرر کے ذریعہ ایک عظیم ضرر کا
	ازالہ کیا جاتا ہے۔

---

[1] ابو بکر محمد بن ابی سہیل السرخسی، المبسوط، مطبعۃ السعادہ، مصر، ۱۳۲۴ھ، الجزء العاشر ص۲۰

[2] علی ابن ابی بکر المرغینانی، الہدایہ، جلد ثانی ص ۵۳۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دفاعی ضروریات کے تحت نئے محاصل عاید کرنے کے مسئلہ پر امام غزالی بھی مذکورہ فقہاء کے ہم خیال نظر آتے ہیں، اس کے جواز میں ان کے پیش کردہ دلائل امام سرخسی کے دلائل سے کافی ملتے جلتے ہیں[1] چودھویں صدی عیسوی کے اندلس کے مشہور عالم وفقیہ ابو اسحاق شاطبی نے اس مسئلہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کی بحث کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو۔

انا اذا قررنا اماماً	جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ایک قابل اتباع
مطاعاً مفتقراً الی تکثیر	امام کو سرحدوں کی حفاظت اور وسیع
الجنود لسد الثغور	وعریض ملک کے دفاع کی خاطر لشکر
وحمایة الملک المتسع	میں اضافہ وتوسیع کی ضرورت ہے اور
الاقطار وخلا بیت	صورتحال یہ ہے کہ بیت المال خالی ہے
المال وارتفعت	اور فوج کی ضروریات اس قدر بڑھ گئی
حاجات الجند الی	ہیں کہ وہ ان کی کفایت نہ کرسکے ایسی
مالا یکفیهم فللا	حالت میں امام کے لیے جائز ہے
مام اذا کان عدلاً	بشرطیکہ وہ عادل ہو کہ مالداروں پر
ان یوظف علی الاغنیاء	اس مقدار کے مطابق ٹیکس عاید کرے
مایراہ کافیا لهم الی	جو فوج کی ضروریات کے لیے کافی ہو
ان یظهر مال بیت	یہاں تک کہ بیت المال میں اس کے
المال[2]	معروف وسائل سے کوئی آمدنی ہوجائے

بعض فقہی وتاریخی ماخذ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہد وسطی کے ہندوستانی فقہاء کے درمیان بھی مزید محاصل کا مسئلہ زیر بحث آیا تھا وہ بھی اس رائے سے متفق

---

[1] امام غزالی، المستصفی، بولاق، مصر ۱۳۲۲ھ، الجزء الاول ص ۳۰۳-۳۰۴

[2] ابو اسحاق شاطبی، الاعتصام، مصر ۱۹۱۴ء، الجزء الثانی ص ۲۹۵-۲۹۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظر آتے ہیں کہ فوجی و دفاعی ضروریات کے لیے وسائل بیت المال کے ناکافی ہونے کی صورت میں امام کو اصحاب استطاعت شہریوں سے مزید مال فراہم کرنے کا حق حاصل ہے۔ فتاوای فیروز شاہی میں اس مسئلہ سے متعلق استفتاء و فتویٰ ان الفاظ میں مذکور ہے۔

استفتاء: "اگر نعوذ باللہ منہا در بیت المال مال نماند و لشکر کفار لعنہم اللہ رسید اگر بادشاہ مسلمانان بر کسانی کہ در مملکت بادشاہ مال دارند تحکم می کند و از ایشاں مال ستانند و بمسلمانان و غازیان می دہد تا مستعد شوند و بجہاد بیرون آیند و با کفار غزا کنند شرعاً ستیدن آں مال بادشاہ را جائز باشد یانی۔

فتویٰ: باشد واللہ اعلم۔ فی المنافع وان لم یکن فی بیت المال فلا باس بان یتحکم الامام علی ارباب الاموال بقدر ما یتقوی بہ الذین یخرجون للجہاد[1]

۱۹ویں صدی کے معروف حنفی فقیہ ابن عابدین شامی کے خیال میں فوجی ضروریات و دفاعی تقاضوں کے علاوہ اگر مسلم قیدیوں کی رہائی کے لیے مزید وسائل کی فراہمی درکار ہو تو صدر ریاست ارباب اموال سے محاصل کی صورت میں مطلوبہ رقم اکٹھا کر سکتا ہے[2]

عہد جدید میں عرب دنیا کے ایک ممتاز ماہر قانون اسلامی محمد ابو زہرہ لمبے مصالح عامہ کا عین تحفظ تصور کرتے ہیں کہ فوجی ضروریات کے بڑھ جانے کی صورت میں سربراہ مملکت ضرورت کے مطابق مالداروں پر نئے ٹیکس عاید کرے اس لیے کہ اگر وہ ایسا اقدام نہیں

---

[1] فتاوای فیروز شاہی، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن، عربیہ، مذہب ۲۶۳ ع ورق ۲۱۷ ب - ۲۱۸ الف، نیز دیکھئے عین الدین ماہرو، انشاء ماہرو (مرتبہ پروفیسر عبدالرشید) ادارہ تحقیقات پاکستان، لاہور ۱۹۶۵ء مکتوب ۳۰ ع صد ۶۹

[2] ابن عابدین شامی ردالمحتار علی الدرالمختار - دارالطباعۃ المصریہ، ۱۲۷۳ھ، جزثانی ص ۵۶ - ۵۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرے گا تو اس کی دھاک اکھڑ جائے گی اور فتنوں کو سر اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔[1]

مذکورہ مباحث سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہوتی ہے کہ معاشرہ کے محروم و نادار افراد کی کفالت عامہ، ملک کا دفاع اور قیدیوں کی رہائی جیسی اہم اجتماعی ضروریات درپیش ہوں اور بیت المال کے وسائل ان میں سے کسی ایک کی بھی تکمیل کے لیے ناکافی ہوں تو حسب استطاعت شہریوں پر نئے محاصل عاید کیے جا سکتے ہیں۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ ان کے علاوہ اجتماعی نوعیت کے دیگر امور کی انجام دہی کا مسئلہ درپیش ہو تو ریاست اپنے اس اختیار کو اس صورت میں بھی استعمال کر سکتی ہے کہ نہیں، اس سلسلہ میں فقہاء کے یہاں عام طور پر کوئی صراحت نہیں ملتی تاہم اوپر کی تفصیلات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ تمام کام جو ریاست کی بنیادی ذمہ داریوں میں داخل ہیں یا ان کی تکمیل کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں ان کے لیے اگر مزید وسائل کی فراہمی درکار ہو تو ریاست کو وہ اختیار یہاں بھی ملنا چاہیے جو اسے دفاعی و فوجی ضروریات کے ضمن میں حاصل ہے۔ بلاشبہ اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں یا اجتماعی ضروریات اہمیت کے اعتبار سے یکساں نہیں ہیں لیکن وہ اس طریقہ سے باہم مربوط ہیں اور ایک دوسرے کی ممد و معاون ہیں کہ کسی ایک کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر دفاعی قوت کا استحکام اور ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کا اہتمام مختلف نوعیت کی ذمہ داریاں ہیں، لیکن آج کے دور میں دفاعی قوت ملک کی معاشی ترقی سے اس درجہ منسلک ہے کہ اس کے بغیر کسی ملک کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اپنے کو دفاعی سطح پر مضبوط کرے۔ اسی طرح سائنسی و تکنیکی تعلیم کا مسئلہ ہے بظاہر دفاعی یا اقتصادی امور سے اس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن موجودہ حالات میں کیا محفوظ دفاعی پالیسی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اندرون ملک جنگی ساز و سامان تیار کیے جائیں اور جدید آلات حرب کے فنی ماہرین پیدا کیے جائیں تاکہ فوجی یا تکنیکی امداد کی راہ

---

[1] سید قطب، العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام، اردو ترجمہ پروفیسر نجات اللہ صدیقی بعنوان "اسلام میں عدل اجتماعی"، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ص ۳۱۳ — ۳۱۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ترقی یافتہ ممالک کو دخل اندازی کا موقعہ نہ مل پائے۔ ظاہر ہے کہ سائنسی و تکنیکی تعلیم کے اہتمام کے بغیر یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابل غور ہے کہ زراعت و تجارت یا صنعت و حرفت کسی بھی ملک کی معیشت کے بنیادی ذرائع ہوتے ہیں ان کو وسعت و ترقی دینے کے لیے بھی ضروری ہے کہ عصری علوم کے ماہرین تیار کیے جائیں اس لیے کہ نئی تحقیقات و تجربات کے سہارے ہی یہ ذرائع نشو و نما پاتے ہیں۔ یہ چند مثالیں تھیں ورنہ ملک و معاشرہ کی ضروریات پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو ان کا باہمی ربط اور اس کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔ اس لیے کسی بھی اجتماعی ضرورت کی تکمیل سے ریاست کی بے اعتنائی مفاد عامہ کے خلاف ہوگی۔

مزید محاصل کی ضرورت پر غور کرتے وقت یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ رفاہِ عام کے جتنے کام ہیں ممکن ہے کہ پہلے رضاکارانہ طور پر مقامی باشندوں کے مالی و جسمانی تعاون کے ذریعہ ان کی انجام دہی آسان رہی ہو۔ لیکن آج ان میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی ہے کہ ریاست کا اقدام ان کی تکمیل کے لیے اشد ضروری ہوگیا ہے، ریاست کے لیے مناسب نہ ہوگا کہ وہ ان کے اہتمام کی ذمہ داری کے تئیں غفلت برتے اس لیے کہ عام رعایا کی بھلائی ان سے وابستہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ بیت المال کی متعلقہ آمدنی سے ان کاموں کے اخراجات پورے ہو جائیں۔ ریاست کو ان کے لیے مزید وسائل درکار ہوسکتے ہیں ایسے حالات میں اگر وہ اپنے اصحاب استطاعت شہریوں پر نیا ٹکس عاید کرے تو اس کے جواز میں کیا کلام ہوسکتا ہے رفاہ عام کے کاموں کی تکمیل اور معاشی ترقی کے اہتمام کی خاطر بعض فقہاء نے صراحتہً ریاست کے لیے مزید وسائل کی فراہمی کو جائز قرار دیا ہے۔ ماوردی کے خیال میں شہر میں پانی کی سپلائی کی بحالی، شہروں کی فصیل بندی، مساجد کی تعمیر و مرمت، نہروں کی کھدائی اور مسافروں کو سہولیات بہم پہونچانے کے لیے اگر بیت المال کے معروف وسائل کافی نہ ہوں تو امام یا سلطان اصحاب دولت سے متعینہ محاصل کے علاوہ مزید مال حاصل کرسکتا ہے[۱]۔ امام ابو یوسف نے نہروں کی تعمیر کے سلسلہ میں خلیفہ ہارون رشید کو

---

[۱] ماوردی، الاحکام السلطانیہ ص ۲۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر اہل سواد کو بڑی بڑی نہروں کی کھدائی یا صفائی کی ضرورت ہو جن کا تعلق دجلہ وفرات سے ہو تو اس کام کی انجام دہی ریاست کے ذمہ ہوگی اور ان کے اخراجات بیت المال و مقامی باشندے دونوں کو برداشت کرنے ہوں گے[1] یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ فقہاء نے جن رفاہی کاموں کی تکمیل کے لیے مزید محاصل کی ضرورت اور اس کے جواز پر اظہار خیال کیا ہے وہ ان کے اپنے دور کے حالات کی روشنی میں تھا موجودہ دور میں نئے حالات و نئے تقاضوں کے مطابق اجتماعی مفاد یا رفاہ عام کے جو کام مطلوب ہیں انھیں پورا کرنے کے لیے بھی بوقت ضرورت نئے ذرائع آمدنی مہیا کرنا شرعی اصول کے منافی نہ ہوگا، درحقیقت ضرورت پڑنے پر مزید محاصل کا دائرہ ان تمام امور تک وسیع کیا جا سکتا ہے جن سے کوئی اجتماعی مفاد وابستہ ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اگر واقعتہً نیا محصول عاید کرنا ضروری ہو جائے تو اس کی مقدار کیا ہوگی۔ اس ضمن میں فقہاء نے بصراحت یہ لکھا ہے کہ مقدار کا تعین ضرورت کی نوعیت کے اعتبار سے ہوگا[2] یعنی اس کی شرح اس انداز سے متعین کی جانی چاہیے کہ اس کی مجموعی آمدنی پیش آمدہ ضروریات کے لیے کافی ہو جائے مزید براں ادا کرنے والوں کی استطاعت کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ پڑنے پائے، اس لیے کہ نئے محصول سے مقصود ناگزیر اجتماعی ضروریات کی تکمیل اور اجتماعی مفاد کا تحفظ ہے نہ کہ اس کی آمدنی سے خزانہ کو مالا مال کرنا یا اجتماعی ضرورت کے بہانہ عوام کا استحصال کرنا۔ اصولی طور پر ذی استطاعت صرف اسی حد تک مزید محاصل ادا کرنے کے مکلف ہیں جس حد تک اجتماعی ضروریات کے لیے سرمایہ درکار ہو۔ جہاں تک نئے محاصل کی مدت تحصیل کا تعلق ہے فقہاء نے اس سلسلہ میں یہ وضاحت کی ہے کہ نئے محصول کی وصولی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ بیت المال میں

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۶۲-۶۳

[2] شاطبی، الاعتصام، الجزء الثانی، ص ۲۹۸، سرخسی، محولہ بالا، ص ۲۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس قدر آمدنی ہو جائے جو متعلقہ ضرورت کی کفالت کر سکے[۱] یہ غالباً اس صورت میں ہے جب کہ درپیش ضرورت ہنگامی ہو یا کسی اجتماعی کام کی انجام دہی عارضی طور پر مقصود ہو لیکن اگر ضرورت عارضی نہ ہو بلکہ اجتماعی مفاد کے کسی کام یا ترقیاتی منصوبہ کو مستقل طور پر جاری رکھنا ہو اور اس کے لیے مزید وسائل کی ضرورت ہو تو اس سلسلہ میں جو محصول یا ٹیکس عاید کیا جائے گا اس کی نوعیت عارضی یا اتفاقی نہیں رہ سکتی بلکہ وہ مستقل حیثیت اختیار کرلے گا اور سچ پوچھئے تو موجودہ دور کے بجٹ سسٹم کے تحت مزید وسائل کی فراہمی کا مسئلہ محض اتفاقی یا ہنگامی نوعیت کا نہیں رہ گیا ہے بلکہ یہ مستقل طور پر پیش آسکتا ہے۔ اس نظم کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ سالانہ آمد و خرچ کے تخمینہ کی روشنی میں بآسانی یہ پتہ چل جاتا ہے کہ حکومت کو کن امور کی انجام دہی کے لیے مزید وسائل درکار ہوں گے اور کس مقدار میں۔ اسی طرح حکومت کو اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے جن ترقیاتی منصوبوں کو تشکیل دیا ہے وہ اس کے معروف وسائل سے پورے ہو جائیں گے یا ان کے لیے مزید سرمایہ کی ضرورت پڑے گی اس طریقہ سے مزید وسائل کی ضرورت معلوم ہو جانے پر عارضی یا مقامی طور پر وسائل اکٹھا کرنے کے بجائے باقاعدہ محصول کی صورت میں نئے ذرائع آمدنی مہیا کرنا عملی لحاظ سے زیادہ کارآمد و مفید ہوگا۔ البتہ ناگہانی و ہنگامی ضروریات کے لیے حالات کی مناسبت سے وسائل اکٹھا کرنے کا کوئی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ محصول یا ٹیکس ہی کی صورت اپنائی جائے۔

درحقیقت مزید محاصل کی ضرورت طے کرنے کا مسئلہ ہو یا اس کی شرح اور مدت تحصیل کی تعیین کا سوال ان سب کی بابت فیصلہ سربراہ مملکت اور اس کی مشاورتی کونسل کی صوابدید پر موقوف ہے البتہ وہ بنیادی باتیں جنھیں اس ضمن میں مدنظر رکھنا ضروری ہے وہ ہیں شریعت کے عام اصولوں کی رعایت، اجتماعی مفادات کا تحفظ اور

---

[۱] شاطبی، الاعتصام، محولہ بالا، ص۲۹۵ – ۲۹۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انصاف پسندی۔ دور جدید میں سید قطب کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"اسلام نے زکوٰۃ کو مال میں سے ایک واجب الوصول حق قرار دیا ہے جسے وہ لوگوں پر قانوناً لازم قرار دیتا ہے...... مزید براں اس نے امام کو یہ حق بھی دیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ اس قدر ٹیکس وصول کرے جس سے ہر طرح کی ضرورت کا ازالہ ہو سکے تنگی دور کی جا سکے اور بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے مفادات و مصالح محفوظ کیے جا سکیں، یہ بھی ضرورت پڑنے پر زکوٰۃ ہی کی طرح ایک حق ہو جاتا ہے جس کی بابت فیصلہ کا انحصار اسلامی نظام کے عام اصولوں امت کے مصالح اور امام کی انصاف پسندی و دیانت داری پر ہے"۔ [2]

نئے محاصل عاید کرنے میں اسلامی شریعت کی یہی حد بندیاں ہیں جو حکومت کو عوام سے بیجا مطالبہ کرنے اور ضرورت کے بہانے شہریوں کو نئے نئے محاصل سے زیر بار کرنے سے باز رکھتی ہیں ان رہنما اصولوں کی روشنی میں عاید کیے جانے والے نئے محاصل کا موازنہ ان محاصل و ٹیکسوں سے نہیں کیا جا سکتا جو عہد وسطیٰ میں مسلم بادشاہوں کی حکومت کے تحت شریعت کے متعینہ محاصل کے علاوہ وصول کیے جاتے تھے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ان ٹیکسوں کو شریعت کے مطابق قرار دینا صحیح نہ ہوگا جنھیں حکومت کا مقامی عملہ دیہی علاقوں کے باشندوں سے معمولی معمولی سرکاری خدمتوں کے بدلہ وصول کرتا تھا یا جو قصبوں و بازاروں میں مختلف پیشوں اور خرید و فروخت کی معمولی اشیاء پر عاید کیے جاتے تھے [3] اسی طرح حکومت کی جانب سے لگائے جانے والے وہ نئے محاصل بھی شرعی اصول کی کسوٹی پر پورے نہیں اتر سکتے جن

---

[1] امام شاطبی نے صدر ریاست کے لیے نئے محاصل کے اختیار کو تسلیم کرتے ہوئے صراحتہً یہ لکھا ہے کہ بشرطیکہ وہ عادل ہو۔ (الاعتصام، ص ۲۱۵) [2] اسلام میں عدل اجتماعی ص ۲۳۸

[3] ان ٹیکسوں کی نوعیت پر مختصر بحث کے لیے دیکھیے خاکسار کا مضمون "عہد فیروز شاہی کا نظام محاصل شرعی قوانین کی روشنی میں" مطبوعہ تحقیقات اسلامی، جلد ۲ شمارہ ۱ (جنوری - مارچ ۱۹۸۳ء)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی شرح ان کاموں کے مصارف سے میل نہیں کھاتا جن کے لیے وہ مخصوص ہیں یا جو عوام کے فلاحی کاموں کے نام پر عاید کیے جاتے ہیں اور ان کی آمدنی غیر ضروری مصارف میں خرچ کر دی جاتی ہے۔

آخر میں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ نئے محاصل کے جواز کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر ہر دور میں علماء و فقہاء کا اتفاق رہا ہو۔ علماء کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو مسلمانوں کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور کوئی حق تسلیم نہیں کرتا دسویں صدی عیسوی کے ایک مشہور فقیہ عبدالوہاب شعرانی اسی رائے کے حامل تھے بلکہ انھوں نے اسے علماء (غالباً اپنے دور کے) کا متفق علیہ مسئلہ بتایا ہے ان کے الفاظ میں "اجمع العلماء ان لیس فی المال سوی الزکوٰۃ"[1] (علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور کوئی (حق) نہیں ہے) دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے برخلاف تیرہویں صدی عیسوی کے ایک ممتاز فقیہ امام قرطبی کے بقول جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد کوئی (اجتماعی) ضرورت آپڑے تو مسلمانوں پر مزید مال صرف کرنا واجب ہے۔ امام قرطبی لکھتے ہیں "واتفق العلماء علی انہ اذا نزلت بالمسلمین حاجۃ بعد اداء الزکوٰۃ فانہ یجب صرف المال الیھا"[2] شعرانی کے قول کی یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ اس سے مراد قانوناً مال میں اس فریضہ کے علاوہ کسی اور حق کی نفی ہے جو کسی شخص پر ایک مخصوص مقدار میں مال رکھنے کی وجہ سے عاید ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بہر حال یہ ثابت ہوتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ پر علماء متفق الرائے نہ تھے اس مسئلہ پر علماء کا اختلاف ابن تیمیہ کی بحث سے بھی ظاہر ہوتا ہے اس لیے کہ انھوں نے ان فقہاء کی رائے کی سختی سے تردید کی ہے جو مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور کوئی حق تسلیم نہیں کرتے تھے[3] خود

---

[1] عبدالوہاب شعرانی، کتاب المیزان الکبریٰ، مصر ۱۲۷۵ھ، جلد دوم ص۱ [2] قرطبی، احکام القرآن محولہ بالا، ص ۲۴۲ [3] فتاوای ابن تیمیہ، محولہ بالا، جلد ۲۹، ص ۱۸۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امام شاطبی (جنھوں نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے) کے عہد (متوفی ۱۲۸۸ء) میں اندلس کے علماء اس کی بابت مختلف رائے رکھتے تھے۔ جب ان کے زمانہ میں اندلس کے بعض علاقوں میں دفاعی مقاصد کے تحت شہر پناہ کی تعمیر کے لیے بعض مخصوص محاصل عاید کیے گئے تو وہاں کے مفتی اعظم نے اسے خلاف شریعت عمل قرار دیا۔ شاطبی نے اس مسلک سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے مصالح مرسلہ کی رعایت و دیگر دلائل کی بنیادوں پر اس کا جواز ثابت کیا[1] مزید براں بیت المال کی باقیماندہ آمدنی یا فاضل رقم کو محفوظ رکھنے کی بابت فقہاء کے اختلاف سے بھی اس موضوع کا مختلف فیہ ہونا ثابت ہوتا ہے، بعض فقہاء کی رائے میں بیت المال میں جو آمدنی بچ رہے گی اسے محفوظ رکھا جائے گا تاکہ اتفاقی ضروریات کے وقت ان سے کام لیا جا سکے جبکہ بعض دوسرے فقہاء اسے محفوظ رکھنے کو صحیح نہیں تصور کرتے اس لیے کہ ان کے خیال میں ہنگامی ضروریات کے وقت عوام سے مزید مال حاصل کرنا شرعاً جائز ہے[2] اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عہد وسطیٰ میں بعض مسلم حکمرانوں نے جب نئے محاصل کی ضرورت محسوس کی تو اس کے لیے عملی اقدام سے قبل معاصر علماء کی رائے طلب کی۔ عہد سلطنت میں فیروز شاہ تغلق نے جب سرکاری اخراجات سے تعمیر کی جانے والی نہروں سے آبپاشی پر محصول عاید کرنا چاہا تو پہلے معاصر علماء کی ایک مجلس منعقد کر کے ان کی رائے معلوم کی اور پھر اس سے متعلق اپنا فیصلہ صادر کیا۔[3] اس طرح کی مثالیں تاریخ کے مختلف ادوار میں ملتی ہیں[4] ان مثالوں سے بھی یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ اور اجتہادی رہا ہے ورنہ سلاطینِ وقت کا اس مسئلہ پر علماء سے تبادلہ خیال کوئی معنی نہیں رکھتا اس لیے نئے محاصل سے متعلق اوپر کی تفصیلات کے باوجود یہ مسئلہ اپنی اختلافی و اجتہادی نوعیت کی وجہ سے مزید غور و فکر اور تحقیق کا داعی ہے، بالخصوص موجودہ حالات میں جبکہ نئے

---

[1] اسلام کا نظریہ ملکیت، ص ۵۱۵ [2] ماوردی، الاحکام السلطانیہ ص ۱۸۹
[3] شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۱۲۹-۱۳۰
[4] اس نوع کی کچھ مثالوں کے لیے دیکھئے اسلام کا نظریہ ملکیت ص ۵۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقاضوں کے تحت ریاست کی ذمہ داریوں اور اجتماعی کاموں میں دن بہ دن وسعت وترقی محسوس کی جارہی ہے فقہی نقطۂ نظر سے یہ فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام سرمایہ پر جو ٹیکس عاید کرتا ہے اس کی آخری حد ہمیشہ کے لیے زکوٰۃ مانی جائے اور ریاست کی ذرائع آمدنی متعینہ محاصل تک محدود رکھی جائے یا بوقت ضرورت اجتماعی مفاد کے کاموں کے لیے اسے مزید محاصل عاید کرنے کا اختیار تسلیم کیا جائے اور اس کے ذرائع آمدنی میں وسعت دی جائے۔ چنانچہ راقم الحروف کے خیال میں اجتماعی مفادات کا تحفظ اور مصالح عامہ کی رعایت کا تقاضا یہی ہے کہ ریاست کے اس اختیار کو تسلیم کیا جائے جیسا کہ اس دور میں اسلامی معاشیات کے ماہر پروفیسر نجات اللہ صدیقی نے نقلی وعقلی دلائل کی روشنی میں نہ صرف مزید محاصل کی ضرورت کو ثابت کیا ہے بلکہ پر زور لفظوں میں یہ خیال پیش کیا ہے کہ اسلامی ریاست کو رہنما اصولوں کی رعایت کی شرط کے ساتھ اس کے عاید کرنے کا اختیار حاصل ہے[1] واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے صدر ریاست کے اختیار کو عام حالات میں محدود کرنے کے ساتھ امت وعوام کے مصالح کے بارے میں اس کو وسعت دی ہے تاکہ وہ ان سے کام لے کر ان امور کو انجام دے سکے جن سے کسی بھی حیثیت میں امت کا مفاد وابستہ ہو اور ہر اس خرابی کو دور کر سکے جو امت کے لیے ضرر رساں ہو البتہ ایسا کرنے میں اگر وہ کسی بات کا پابند ہے تو اس کا کہ شریعت کے نصوص کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ سید قطب نے صحیح کہا ہے:۔

"درحقیقت زکوٰۃ مال ودولت پر عاید کیے جانے والی ٹیکس کی ادنیٰ ترین شرح ہے اور یہ ان حالات کے لیے ہے جبکہ جماعت کو محاصل زکوٰۃ کے بعد مزید فنڈ کی ضرورت نہ پڑے ایسے حالات میں جبکہ زکوٰۃ کی آمدنی کافی نہ ہو اسلام کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں اس نے شریعت اسلامی کو نافذ کرنے والے صاحب امر کو سرمایہ پر ٹیکس لگانے کے وسیع اختیارات دیے ہیں وہ سرمایہ سے اس قدر طلب کرنے کا مجاز ہے جس قدر کہ اصلاح حال کے لیے ضروری ہو"[2]

---

[1] پروفیسر نجات اللہ صاحب کے خیالات کے لیے دیکھئے اسلام کا نظریہ ملکیت، محولہ بالا، ص ۵۰۹ - ۵۲۲

[2] اسلام میں عدل اجتماعی، ص ۳۰۸ - ۳۰۹

© rasailojaraid.com